ملک کا حقیقی مسئلہ

اور

اس کے لئے اصلی خطرہ

یعنی:

پیامِ انسانیت کنونشن

منعقدہ:

۲۷، ۲۸، اکتوبر ۱۹۸۰ء

سفید بارہ دری، قیصر باغ، لکھنؤ

کا

خطبۂ صدارت اور اختتامی تقریر

از:

مولانا ابوالحسن علی ندوی

شائع کردہ:

پیامِ انسانیت فورم لکھنؤ

پیش لفظ

از: ــــــــــ ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی

ملک میں بڑھتی ہوئی منافرت اور اخلاقی بگاڑ سے متاثر ہوکر مولانا ابوالحسن علی ندوی (علی میاں صاحب) نے ۱۹۵۴ء سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے جلسوں کو خطاب کرنے کا سلسلہ شروع کیا۔ اس میں وقفے ہوتے رہے، مسئلہ کی اہمیت کا تقاضا اتنا بڑھا کہ انھوں نے ۱۹۷۴ء میں الہ آباد سے 'پیامِ انسانیت' کے عنوان سے نئی مہم کا آغاز کیا۔ اس سلسلہ میں اترپردیش، راجستھان، ہریانہ، پنجاب، مدھیہ پردیش، کرناٹک، مہاراشٹر کے طویل دورے ہوئے اور لکھنؤ، دہلی وغیرہ میں متعدد جلسے ہوئے۔

اگست ۱۹۸۰ء میں مراد آباد، علی گڑھ، الہ آباد اور متعدد دوسرے شہروں میں پیش آنے والے واقعات سے یہ احساس پیدا ہوا کہ کل ہند سطح پر ہر مکتب فکر کے لوگوں کو لکھنؤ میں مدعو کیا جائے۔

اس سلسلہ میں ۲۷، ۲۸ر اکتوبر کو لکھنؤ کی سفید بارہ دری قیصر باغ میں بہت عرصہ کے بعد ایک نمائندہ منتخب جلسہ بڑے پُرسکون، باوقار اور سنجیدہ ماحول میں ہوا۔ ہر طرف سکون کی فضا تھی اور ہر شخص بڑھتی ہوئی منافرت کو دُور کرنے کی اس کوشش کو سراہ رہا تھا، اس میں ملک کے چیدہ دانشور، یونیورسٹیوں کے پروفیسر، سابق و حال وزراء، سابق چیف سکریٹری، نیز سماجی و سوشل رفاہی کارکن، ادیب، شاعر و اساتذہ، سیاسی پارٹیوں کے ذمہ دار، عہدیدار، تاجر، وکیل اور ڈاکٹر ہر طبقے کے لوگ ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، بدھ شریک ہوئے، پورے

جلسے کی کارروائی نہایت پُرسکون ماحول میں ہوئی۔ مقررین نے پورے درد اور دلسوزی کے ساتھ سماج کی بگڑتی ہوئی حالت پر گہری تشویش کا اظہار کیا، اور ہر ایک نے مولانا علی میاں صاحب صدر جلسہ اور پیام انسانیت کے روح رواں کے خیالات کی نہ صرف تائید کی بلکہ اسے وقت کا تقاضا کہا اور ہر طرح تعاون کا یقین دلایا۔ پروفیسر سوندھی، جواہر لال یونیورسٹی نے بہت واضح الفاظ میں کہا کہ:

> کمیونزم اور سرمایہ داری کا نظام دونوں فیل ہوچکے ہیں، ان سے کسی خیر کی امید نہیں۔ مولانا سے مخاطب ہوکر انھوں نے کہا۔ ہماری یونیورسٹیوں میں تعلیمی نظام ناقص ہے۔ ہم آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ آپ ہماری رہنمائی کریں۔ انھوں نے بہت درد کے ساتھ کہا کہ ——— آپ جلد اس طرف متوجہ ہوں۔

اجلاس میں مولانا کے پیش کردہ چار نکاتی پروگرام پر سیر حاصل تبصرہ، اور تبادلۂ خیال ہوا۔ سب سے پہلی تجویز اخلاقی اور انسانی بنیادوں پر، عوامی رابطہ سے متعلق تھی جو مولوی عبدالکریم پاریکھ صاحب ناگپور نے پیش کی۔ ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی منشی لال سہاٹک اور بہت سے لوگوں نے تائید کی۔ اس میں خصوصیت سے دانشوروں اور مذہبی لوگوں کو متوجہ کیا گیا ہے کہ وہ فعال اور متحرک ہوں اور بڑے پیمانہ پر عوام میں میل ملاپ کی فضا بنائیں۔

دوسری تجویز تعلیمی نصاب کی اصلاح کے سلسلہ میں تھی، جس کے نتیجہ میں آپس میں منافرت پیدا ہو رہی ہے، تعلقات خراب ہو رہے ہیں اور بار بار فساد پھوٹ پڑتے ہیں۔ یہ تجویز پروفیسر میر جعفر علی سابق پرنسپل الامین کالج بنگلور (کرناٹک) نے پیش کی، جس کی تائید پروفیسر منشاء الرحمٰن صدر شعبہ اردو ناگپور یونیورسٹی نے کی۔

تیسری تجویز اخبارات میں مبالغہ آمیز، غیر حقیقت پسندانہ، یک طرفہ اور فرقہ وارانہ خبروں کی اشاعت سے متعلق تھی کہ اس کی اصلاح کی جائے، اس کے بغیر امن مشکل ہے اخبارات کو خاص طور پر تعمیری رویہ اپنانے پر متوجہ کیا گیا۔ اس سلسلہ میں کانشی رام جو باسف (BOSEF) کے صدر اور کمزور طبقہ کے ابھرتے ہوئے رہنما ہیں، انھوں نے اخبار نکالنے کی اسکیم بھی پیش کی، تاکہ بڑے اخباروں کی اجارہ داری ختم ہو جس پر سرمایہ داروں کا قبضہ ہے جو بلیک آؤٹ بھی کرتے ہیں اور بلیک میل بھی۔

چوتھی تجویز پولیس کی اصلاح اس کی از سر نو تنظیم اور اسے باشعور و باضمیر بنانے سے متعلق تھی جسے پونہ کے سابق میئر نے، جو مہاراشٹر کے سابق ہوم منسٹر بھی رہ چکے ہیں، پیش کی، جس میں خاص طور پر کمزور طبقہ بالخصوص مسلمانوں کی نمائندگی کی بات کہی وکیل احمد انصاری صاحب کے علاوہ کئی حضرات نے اس کی تائید کی۔

ان تمام تجاویز پر عمل درآمد کے لئے صدر جلسہ کو ایک وفد کی تشکیل کا مجاز کیا گیا۔ تاکہ ان تجاویز کو حکومت اور ملک کے سامنے پیش کیا جا سکے، اور اس پر تیزی سے عملدرآمد ہو سکے۔

اس کنونشن کے لئے جو خطبۂ صدارت لکھا گیا تھا وہ اردو، انگریزی اور مختصراً ہندی میں چھپوالیا گیا تھا اور کنونشن میں تقسیم کیا گیا اور بعد میں بھی ملک کے دانشوروں اور سیاسی پارٹیوں کے رہنماؤں کو بھیجا گیا، وہ محدود تعداد میں چھاپا گیا تھا اس لئے بہت جلد ختم ہو گیا، چونکہ اس کی مانگ تھی اس لئے اردو میں اب دوبارہ چھاپ کے ہدیۂ قارئین کیا جا رہا ہے۔ امید ہے کہ سنجیدگی اور غور سے پڑھا جائے گا اور اس سے شایانِ شان فائدہ اٹھایا جائے گا۔

مناسب معلوم ہوا کہ خطبۂ صدارت کے ساتھ مولانا کی وہ اختتامی تقریر بھی شامل کر دی جائے جو کنونشن کے بالکل آخر میں کی گئی تھی اور جس نے کنونشن کی پوری فضا اور سامعین کے دل پر خاص اثر ڈالا تھا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضرات!

انسانیت کے حال و مستقبل اور سارے تمدنی، معاشی، سیاسی حتیٰ کہ اخلاقی اور مذہبی مسائل کا انحصار، اور تمام فلسفوں و افکار و نظریات کا دار و مدار تمام تر اس پر ہے کہ انسان موجود اور محفوظ ہے۔ اس کو اپنی زندگی کی طرف سے اطمینان، انسانی زندگی کی قدر و قیمت کا احساس اور اس کے تقدس پر غیر متزلزل عقیدہ ہے، اس عقیدہ نے کہ انسان ہی اس دنیا کی پیدائش کا مقصود اور اس کائنات کا سب سے بیش قیمت وجود ہے اور اس کے اندر بہتر سے بہتر بننے کی صلاحیت موجود ہے۔ دنیا کے ذہین ترین شریف ترین اور لائق ترین انسانوں کو انسانوں پر محنت صرف کرنے پر آمادہ کیا اور انھوں نے ان کی ذہنی صلاحیتوں اور ان کے ذہن و دماغ کے سوتوں کو چھیڑا، اور وہ تمام اصلاحی، تعمیری، تخلیقی، علمی، ادبی، تمدنی اور روحانی شاہکار وجود میں آئے جن پر قدیم و جدید دنیا کو فخر ہے، تاریخ کے قدیم ترین دور سے لے کر ہمارے زمانہ تک جس چیز نے انسانیت کی شمع مسلسل طور پر روشن رکھی، وہ خدا کی یہ نعمت ہے کہ اچھے انسان انسان سے مایوس نہیں ہوئے، انھوں نے اس کو ناقابل علاج مریض اور ناقابل صلاح حیوان نہیں سمجھا۔ وہ کبھی اس کے وجود سے ایسے متنفر نہیں ہوئے کہ اس کی صورت دیکھنے تک کے روادار نہ ہوں، انھوں نے کبھی اس کے زندہ رہنے کے استحقاق کا انکار نہیں کیا، انسانیت کا چراغ بے تیل بتی کے جل سکتا ہے وہ ہوا کے تیز جھونکوں اور طوفان کے تھپیڑوں میں روشن رہ سکتا ہے اور انسانیت کی تاریخ بتاتی ہے کہ ہمت والوں اور انسانیت کا درد رکھنے والوں نے برسوں بے تیل بتی کے انسانیت کا چراغ روشن رکھا، انھوں نے پیٹ پر پتھر باندھ کر اور مسلسل فاقہ کر کے جنگلوں اور بیابانوں، کڑاکے

کے جاڑوں کی راتوں اور تپتی ہوئی دوپہریوں میں انسانیت کی خدمت کی، ان میں سے کوئی چیز اُن کی ہمّت توڑنے اور اُن کو اُن کے مقدّس کام سے روکنے کے لئے کافی نہ تھی، ان کی نہ ختم ہونے والی قوّتِ مقابلہ کا راز، اور ان کی حیرت انگیز قوتِ عمل کی بنیاد یہ تھی کہ وہ انسان کو دستِ قدرت کا شاہکار (MASTER PEICE) سمجھتے تھے، ان کو انسان کی فطرتِ سلیم پر یقین و اعتماد تھا، ان کو یقین تھا کہ انسان کے لئے بُرائی عارضی، اور بھلائی اصلی اور فطری ہے، ان کو یقین تھا کہ وہ انسان پر جو محنت کریں گے وہ کبھی نہ کبھی رنگ لائے گی، ان کے عقیدہ میں اس باغ کی ہر کلی کو کھلنا اور حسین بننا چاہیئے عالمِ انسانی میں کوئی چیز اس سے زیادہ خطرناک اور تشویش انگیز نہیں کہ انسان انسان سے ناامید ہو جائے اور اس سے زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ وہ اس نفرت و یاس کے جنون میں بے زبان عورتوں اور معصوم بچوں پر دست درازی کرے اور غنچوں کو کھلنے اور مسکرانے سے پہلے ہی مسل کر رکھ دے۔ تعلیم و تربیت ہو یا اصلاح و ترقی معاشی خوش حالی ہو یا سیاسی استحکام یہ نشیمن جس شاخ پر قائم ہے اور ہمیشہ جس شاخ پر قائم رہے گا وہ انسانی زندگی کے تحفظ اور امن و امان کی فضا ہے اس لئے نشیمن کو سجانے اور بنانے کے منصوبوں اور اس کی ترتیب و تنظیم کی بحثوں سے پہلے اس شاخ کی حفاظت ضروری ہے۔

بے گناہ کمزور، بے بس اور نہتے انسانوں، عورتوں اور بچوں پر ظلم اور دست درازی خواہ وہ کسی مذہب و ملّت سے تعلق رکھتے ہوں اور خواہ یہ اقدام کسی صحیح یا غلط اشتعال کی بنا پر، یا انتقامی جذبہ کے ماتحت ہو، وہ عمل ہے جس نے بڑے بڑے طاقتور، ترقی یافتہ، وسیع اور زرخیز ملکوں اور سلطنتوں کو بے چراغ اور تاراج کر دیا ہے اور تاریخ میں صرف ان کا نام باقی رہ گیا ہے، خدا کے وجود کے بعد جس حقیقت پر تمام مذاہب، فرقوں اور مکاتبِ خیال کا اتفاق ہے، وہ یہ کہ ظلم (خواہ کسی سے سرزد ہو) بڑا گناہ (مہاپاپ) اور ملکوں اور قوموں کے حق میں سمِ قاتل ہے اور اس کا

نتیجہ دیر یا سویر نکل کر رہتا ہے، اور اس کی موجودگی میں کوئی ملک یا قوم (خواہ اس کے پاس کیسے ہی قدرتی وسائل جنگی طاقت، عددی کثرت، شاندار تاریخ اور علم وادب اور فلسفہ کے خزانے ہوں) پھل پھول نہیں سکتی۔

مجھے اجازت دیجئے کہ میں اس موقع پر، اردو کا وہ سیدھا سادا شعر پڑھوں جو بچپن میں ہمیں یاد کرایا جاتا تھا اور ہماری تختیوں اور کاپیوں پر لکھا جاتا تھا اور وہ اپنی سادگی کے باوجود اب بھی اس قابل ہے کہ ایوانِ حکومت اور قصرِ عدالت سے لے کر لوح دل تک پر لکھا جائے۔

ظلم کی ٹہنی کبھی پھلتی نہیں
ناؤ کاغذ کی سدا چلتی نہیں

اس لئے ہر زمانہ میں ملک کے سچے بہی خواہوں، اور صاحب ضمیر اور دانشور انسانوں نے جن کی خدا کے بے لاگ قانون اور تاریخ انسانی کے مسلسل تجربوں، اور متواتر شہادتوں پر نظر تھی، اپنے ملک اور معاشرہ کے لئے ہر اندرونی اور بیرونی خطرہ سے بڑھ کر اس کو خطرہ سمجھا اور اپنے ملک کے اندر ظلم کرنے والوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا، ظلم سے روکنے اور ظلم کی آگ نہ پھیلنے دینے کے لئے انھوں نے اپنی جان کی بازی لگادی اور اس کو ملک کی سب سے بڑی خدمت، اور حقیقی حبّ الوطنی قرار دیا، اس لئے کہ وہ جانتے تھے کہ اندر کا ظلم وزیادتی باہر والوں کے ظلم وزیادتی اور ان کی ظالمانہ حکومت سے زیادہ ملک کے حق میں تباہ کن اور خطرناک ہے، بیرونی ظلم کی صورت میں ملک اور قوم مظلوم ہوتی ہے، خدا کی مدد، اچھّے انسانوں کی دعائیں اور مظلوموں کی آہیں اس کے ساتھ ہوتی ہیں اور اندرونی ظلم کی صورت میں وہ ملک، خدا کی مدد سے محروم اور خود مظلوموں کی آہوں اور دکھے دلوں کی کراہوں کا نشانہ بنتا ہے، جن کی تاثیر پر تمام مذاہب، اخلاقی فلسفوں، اور صحت مند وصالح ادب وشاعری کا اتفاق ہے اور جنھوں نے کبھی کبھی (بلا امتیاز مذہب وملت) صدیوں کی وسیع اور مستحکم سلطنتوں کا چراغ گل کردیا اور

ان تہذیبوں اور تمدنوں کو ہمیشہ کے لئے موت کی نیند سلا دیا، جن کا کسی زمانہ میں دنیا میں ڈنکا بجتا تھا اور جس کی مثالیں اس مادی اور مشینی دور میں بھی خاندانوں اور محلوں سے برادریوں اور بستیوں کے محدود دائرے میں اب بھی علم میں آتی رہتی ہیں، اور خدا کی یہ لاٹھی جس میں آواز نہیں، حقیقت بیں نگاہوں کو اب بھی دنیا کی ان بڑی طاقتوں کے جاہ وجلال کے مرکزوں میں بھی اپنا کام کرتی ہوئی نظر آجاتی ہے جو اپنے سامنے کسی کی حقیقت نہیں سمجھتے۔

حاضرین کرام! ملک کی طاقت کا حقیقی سرچشمہ اور جینے اور پھلنے پھولنے کے لئے اس کا سب سے بڑا سہارا ایسے حق گو اور بے لاگ انسانوں کا وجود ہے جو بڑے سے بڑے نازک اور جذباتی موقعہ پر ظلم کو ظلم، ناانصافی کو ناانصافی اور غلطی کو غلطی کہہ سکتے ہیں، اگر آپ حقیقی کسی قوم کی بیداری اور اس کی زندگی کی صلاحیتوں کو جانچنا چاہتے ہیں، اور یہ اندازہ کرنا چاہتے ہیں کہ وہ قوم یا ملک انسانیت اور اخلاق اور علم وفن کی امانت کی حفاظت کی کہاں تک اہل ہے، تو یہ دیکھئے کہ اس میں کتنے ایسے افراد پائے جاتے ہیں جو تنقید کے موقعہ پر اپنے پرائے کی تمیز نہ کرتے ہوں جو صریح غلطی کے موقع پر بڑی سے بڑی اکثریت اور بڑی سے بڑی طاقتور حکومت کو برملا ٹوک دیتے ہوں، جو مظلوموں اور کمزوروں کے لئے سینہ سپر بن جاتے ہوں اور بگڑے ہوئے حالات میں عیش کے ایوانوں کو چھوڑ کر دیوانوں کی طرح پھرنے لگتے ہوں اور کسی ملامت کرنے والے کی پرواہ نہ کرتے ہوں، جن کو آئندہ کے فوائد اور وقت کے مصالح سچی بات کہنے سے باز نہ رکھتے ہوں، جو حق کی حمایت اور اعلان میں اپنی قوم کا معتوب بننے کو اپنی قوم کا محبوب بننے پر ہزار بار ترجیح دیتے ہوں، جب سارے ملک میں زیادتی حق تلفی، جانبداری اور مصلحت پرستی کی ہوا چل رہی ہو تو وہ اپنا کھانا پینا بھول جائیں اور حالات کو درست کرنے کے لئے کوئی کوشش اٹھا نہ رکھیں، جو وقت کے مسئلہ کے سامنے تمام [illegible] کو بالائے طاق رکھ دیں [illegible] حالت کو بھلا دیں [illegible]

قومیت وملت انسانی جان وآبرو کی حفاظت کے لئے جان کی بازی لگا دیں اگر ایسے افراد اس قوم کی تعداد کے مناسب اور ضرورت کے مطابق پائے جاتے ہیں تو اس قوم اور اس کے مستقبل کی طرف سے مایوس و ہراساں ہونے کی ضرورت نہیں، اس کی ہر پریشانی دور ہو جائے گی، ہر کمی پوری ہو جائے گی، پھر مدم اور دشمن دوست بن جائیں گے، اس کی اخلاقی برتری کا سارے دنیا میں آوازہ بلند ہوگا. اس کے ملک میں خوش حالی، سرسبزی اور شادابی، محبت والفت کا دور آکر رہے گا. اس کی بین الاقوامی حیثیت اچانک بلند ہو جائے گی، قومیں اور ممالک نازک حالات میں اور بین الاقوامی گتھیوں کے سلجھانے کے لئے اس کی مدد کے طالب ہوں گے.

ہمارا عقیدہ ہے کہ ہمارے اس ملک نے ہر دور میں حق کی حمایت کرنے والے مظلوم کا ساتھ دینے والے ظالم کا گریبان پکڑنے والے، اور اس کا ہاتھ روک دینے والے معلم و مصلح اور روحانی لوگ پیدا کئے، یہاں کی سرزمین نے ساتویں صدی ہجری اور تیرہویں صدی عیسوی میں نیم وحشی تاتاریوں، اور جہاں سوز چنگیز خان اور ہلاکو کے ستائے ہوئے اور ان کے وحشیانہ حملوں سے سہمے ہوئے لٹے پٹے انسانی قافلوں کو پناہ دی، اور پھر وہ ہمیشہ اس ملک میں امن وامان کے ساتھ رہے، اور انھوں نے یہاں سکون واطمینان بلکہ خود اعتمادی اور عزت وسربلندی کے احساس کے ساتھ (جو انسانی ذہانتوں اور علم وفن کی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لئے سب سے بڑی محرک طاقت ہے) اپنی ذہانت، صلاحیت کار، ایجاد واختراع، خوش مذاقی وذہنی حسن تعمیر اور انسانی جینیس (GENIUS) کے وہ نمونے پیدا کئے اور علم وفن اور ادب شاعری کے وہ گل کھلائے جن سے صرف ہندوستان ہی نہیں وسط ایشیا کا پورا علاقہ اور مغربی ایشیا اور مشرق وسطیٰ کے ممالک مہک اٹھے. اور انھوں نے اسلامی علوم وفنون اور عربی زبان وادب میں بھی اس نئی نسل کا لوہا مان لیا جو ترکستان اور ایران، عرب عجم اور ہندوستان کی بہترین خصوصیات کی حامل تھی اور جس کے کارناموں سے اب

بھی دنیا کے ایک بڑے حصہ میں ہندوستان کا نام روشن ہے اور وہاں کے علمی و ادبی حلقوں میں وہ اس کے تعارف کا ذریعہ اور اس کی عزت و احترام کا باعث ہے۔

آخر میں ۱۹۴۷ء میں گاندھی جی نے اس ظلم و بربریت کو روکنے اور تمام فرقوں کو ملک میں امن و اعتماد کے ساتھ رہنے کے مقصد کے لئے اپنی قیمتی جان دے دی۔ ہندوستان کسی دور میں کبھی ایسے انسان دوست، حق گو، جری اور جانباز لوگوں سے خالی نہیں رہا۔ جو ظلم و بدی کو روکنے کے لئے سینہ سپر ہو جاتے تھے اور اس کے لئے جان کی بازی لگا دیتے تھے، ملک کی تقسیم کے فیصلہ سے کچھ پہلے سے ہمارے ملک میں فرقہ وارانہ منافرت اور وحشیانہ قتل و غارت گری کے واقعات کا سلسلہ شروع ہو گیا اور تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد یہاں فرقہ وارانہ فسادات رونما ہوئے ان موقعوں پر ملک کے متعدد دانشوروں، عاقلوں اور سیاسی رہنماؤں نے اپنی اندرونی کرب و بے چینی کا اظہار کیا اور بے باکانہ طریقہ پر اس رجحان کی مذمت کی، اور اپنے اپنے انداز بیان اور لب و لہجہ میں اس کے خلاف اظہار خیال کیا۔ آج بھی اگر آپ ان کے بیانات کو پڑھیں تو آپ کو لفظوں کی صورت میں خون کے آنسو اور سطروں اور پیراگراف کی شکل میں دل و جگر کے ٹکڑے نظر آئیں گے، مجھے اجازت دیجئے کہ میں اس موقع پر ملک کے چوٹی کی تین شخصیتوں کی تقریروں اور تحریروں کے تین اقتباسات آپ کے سامنے پیش کروں اس لئے کہ میں کتنی ہی کوشش کروں ان سے بہتر لفظوں میں آج کی صورت حال کی عکاسی اور عکاسی نہیں کر سکتا، جس سے ہر محب وطن کو بے چین ہونا چاہیئے، یہ ہندوستان کے روشن دماغ اور بیدار ضمیر کی آواز اور اس کے دکھے ہوئے دل کی پکار ہے جو وقت پر بلند ہوئی، اس کو کوئی انشا پرداز خوش رخ، خواہ وہ اپنی تحقیقی و تصنیفی سرگرمیوں کے لئے کتنا ہی مشہور ہو اور تحریر و انشا کے میدان کا کتنا وسیع تجربہ رکھتا ہو اس سے بہتر طریقہ پر ان احساسات اور جذبات کو پیش نہیں کر سکتا۔

میں پہلا اقتباس مرحوم ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کے (جو بعد میں ہمارے ملک کے

صدر جمہوریہ ہوئے) اس خطبۂ استقبالیہ کا پیش کروں گا جو انھوں نے شیخ الجامعہ (وائس چانسلر) کی حیثیت سے ۱۷ نومبر ۱۹۴۶ء کو جامعہ اسلامیہ دہلی کی سلور جوبلی میں پڑھا تھا مجھے وہ منظر ابھی تک یاد ہے کہ کرسیٔ صدارت پر ہز ہائینس نواب سر حمید اللہ خاں (نواب صاحب بھوپال) رونق افروز ہیں۔ سامنے کی قطار میں ایک طرف اس وقت کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو، صدر کانگریس مولانا آزاد، ارکان کابینہ سردار پٹیل، مسٹر راج گوپال اچاریہ اور سید آصف علی بیٹھے ہیں، سامنے کی صف میں مسٹر جناح اور عبوری حکومت کے دوسرے مسلم وزراء نواب زادہ لیاقت علی خاں، سردار عبد الرب نشتر، اور نواب غضنفر علی خاں موجود ہیں۔ دائیں بائیں کی پچھلی صفوں میں ہندوستان کے چوٹی کے دانش ور، عالم و ادیب، ماہر تعلیم، اور سوشل ورکر تشریف رکھتے ہیں۔ وقت وہ تھا کہ دہلی میں فرقہ وارانہ فساد پھوٹ پڑا تھا اور چاقو زنی کی کچھ وارداتیں پیش آئی تھیں، پانچ بجے شام سے صبح کے سات بجے تک کرفیو تھا، باہر سے آنے والے معزز مہمان بھی بڑی حفاظت اور احتیاط کے ساتھ اپنی قیام گاہ پہونچائے گئے، اس صورت حال کی فریاد کا اس سے بہتر موقع نہ تھا کہ ہندوستان کے چوٹی کے دانشور عالم و فاضل، جنگ آزادی کے سالار و سپاہی موجود تھے جو اب ہندوستان کی قسمت کے مالک اور امن و امان کے ذمہ دار بھی تھے، ڈاکٹر صاحب نے فرمایا:۔

"آپ سب صاحبان آسمانِ سیاست کے تارے ہیں، لاکھوں نہیں، بلکہ کروڑوں آدمیوں کے دل میں آپ کے لئے جگہ ہے، آپ کی یہاں کی موجودگی سے فائدہ اٹھا کر میں تعلیمی کام کرنے والوں کی طرف سے بڑے ہی دکھ کے ساتھ چند لفظ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ آج ملک میں باہمی منافرت کی جو آگ بھڑک رہی ہے اس میں ہمارا چمن بندی کا کام دیوانہ پن معلوم ہوتا ہے، یہ آگ شرافت اور انسانیت کی سرزمین کو جھلسے دیتی ہے اس میں نیک اور متوازن شخصیتوں کے تازہ پھول کیسے

پیدا ہوں گے ؟ حیوانوں سے بھی پست تر سطح اخلاق پر ہم انسانی اخلاق
کو کیسے سنوار سکیں گے ؟ اس کے لئے خدمت گزار کیسے پیدا کر سکیں گے ؟ جانوروں کی
دنیا میں انسانیت کو کیسے سنبھال سکیں گے ؟ یہ الفاظ شاید کچھ سخت معلوم ہوتے ہوں لیکن ان حالات
کے لئے جو روز بروز ہمارے چاروں طرف پھیل رہے ہیں، اس سے سخت الفاظ بھی
بہت نرم ہوتے، ہم جو اپنے کام کے تقاضوں سے بچوں کا احترام کرنا سیکھتے
ہیں آپ کو کیا بتائیں کہ ہم پر کیا گزرتی ہے، جب ہم سنتے ہیں کہ بہیمیت
کے اس بحران میں معصوم بچے بھی محفوظ نہیں ہیں، شاعر ہندوستانی نے کہا تھا
کہ "ہر بچہ جو دنیا میں آتا ہے اپنے ساتھ یہ پیام لاتا ہے کہ خدا ابھی انسان
سے پوری طرح مایوس نہیں ہوا" مگر کیا ہمارے دیس کا انسان اپنے
سے اتنا مایوس ہو چکا ہے کہ ان معصوم کلیوں کو بھی کھلنے سے پہلے ہی
مسل دینا چاہتا ہے ؟ خدا کے لئے سر جوڑ کر بیٹھئے اور اس آگ کو بجھائیے
یہ وقت اس تحقیق کا نہیں کہ آگ کس نے لگائی، کیسے لگی ؟ — آگ لگی
ہوئی ہے اسے بجھایئے، یہ مسئلہ اس قوم اور اس قوم کے زندہ رہنے کا
نہیں ہے، مہذب انسانی زندگی اور وحشیانہ درندگی میں انتخاب کا
ہے خدا کے لئے اس ملک میں مہذب زندگی کی بنیادوں کو
یوں کھدنے نہ دیجئے۔"

دوسرا اقتباس ملک کے عظیم قائد اور آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم
پنڈت جواہر لال نہرو کی اس تقریر کا ہے جو انھوں نے جون ۱۹۶۲ء کی کسی ابتدائی
تاریخ میں بھوپال میں کی تھی، اس وقت جبل پور اور بعض دوسرے شہروں میں سخت
فرقہ وارانہ فسادات ہوئے تھے اور ان سے پوری دنیا میں ملک کی سا کھ اور اس کے
سیکولر کردار کو دھکا لگا تھا، انھوں نے اس تقریر میں فرمایا۔

"مجھے بڑا دکھ ہے کہ فسادات کے دوران ایک کانگریسی کے بھی حراش

تک نہیں آئی، وہ عام طور پر جرأت و بہادری سے حالات کا مقابلہ نہ کر سکے اور پردہ نشین عورتوں کی طرح گھروں میں چھپے رہے، ہمارے ملک کو کسی بھی بیرونی طاقت سے کوئی گزند نہیں پہنچ سکتا، مگر اس کی داخلی کمزوری اس کے لئے ہلاکت آفریں ثابت ہو سکتی ہے۔

کانگریس کے اندر جو بزدل لوگ ہیں وہ سب سے زیادہ نقصان پہنچا سکتے ہیں ان المناک واقعات کی ذمہ داری اکثریت پر عائد ہوتی ہے یہ کہنا سفید جھوٹ ہے کہ اقلیت فسادات کی ذمہ دار ہے، یہ کہنا بھی ایک غلط بیانی اور انتہائی کمینگی ہے کہ جبلپور میں ہندوؤں نے جو کچھ کیا وہ اپنی حفاظت کے لئے کیا، وہاں جو کچھ ہوا وہ فرقہ پرستوں کی پہلی ہی سے کی ہوئی سازشوں کا نتیجہ تھا، جو اطلاعات ملی ہیں ان سے صاف ظاہر ہے کہ ان فسادات میں سب سے پہلے نقصان مسلمانوں کو پہنچا ہے میں نہیں سوچ سکتا کہ مصیبت زدہ طبقہ حملہ آور بھی ہو سکتا ہے۔

جبلپور یا دوسرے شہروں میں جو کچھ ہوا وہ محدود واقعہ نہیں ہے ان واقعات سے پورا ملک متاثر ہوتا ہے۔ بارہ برس کے بعد بھی اس قسم کے فرقہ وارانہ فسادات کا برپا ہونا ایک خطرناک رجحان ہے جس کی وجہ سے ملک کی ترقی رک جانے کا اندیشہ پیدا ہو گیا ہے۔

یہ اکثریت کا فرض ہے کہ وہ اقلیت کے مفادات اور حقوق کی حفاظت اور نگہداشت کرے، اقلیتوں کے دبائے اور کچلنے سے سماج میں پس ماندگی اور کمزوری پیدا ہوتی ہے اور یہ بات کسی قیمت پر گوارا نہیں کی جا سکتی۔"

تیسرا اقتباس جے پرکاش نرائن جی کے اس تاریخی خط کا ہے جو انھوں نے **جمشید پور اور راوڑکیلا** کے فسادات (مارچ ۱۹۶۴ء) کے بعد ہندوستانی پارلیمنٹ

کے دونوں ایوانوں (لوک سبھا اور راجیہ سبھا) کے صدر اور سیاسی جماعتوں کے نام لکھا تھا۔ اس خط میں وہ فرماتے ہیں:

"جہاں تک مظالم کا تعلق ہے میرے خیال میں کوئی حد باقی نہیں رہی، ہر نفرت انگیز اور شرمناک حرکت کی گئی، عام طور پر جو کچھ ہوا وہ بہت عبرتناک تھا، لیکن بعض معاملوں میں تو بے رحمی اور گراوٹ کا اندازہ کرنا محال ہے ایسی ایسی ہیبت ناک باتیں کی گئی ہیں جن کے بارے میں دہلی یا ملک کو قطعی علم نہیں ہے کہ کس پیمانہ پر کیا ہوا۔"

آگے چل کر وہ لکھتے ہیں:

"مجھے کامل یقین ہے کہ ان بزدلانہ سرگرمیوں کو ایک مشترکہ مرکز سے منظم کیا گیا، افواہوں کے گڑھنے اور ان کو پھیلانے، مالی امداد کے ساتھ منظم اقدام کرنے کی خاطر سارے ہنگامہ کے لئے ایک سیاسی اور فلسفیانہ جواز فراہم کیا گیا۔۔۔ ۔۔۔ یہ بھی ثابت ہو گیا کہ تعلیم درندگی اور مجرمانہ حرکتوں کی طرف سے میلان کا تدارک نہیں، اور یہ بھی کہ حکومت کی انتظامی مشینری کس قدر ناکافی اور نااہل ہے۔"

اسی خط میں وہ تحریر فرماتے ہیں:

"حکومت اور ملک کے دوسرے حلقوں اور جماعتوں کی طرف سے ان فسادات کی لرزہ خیز نوعیت پر پردہ ڈالنے کی جو کوشش کی جاتی ہے وہ خود ملک کے لئے نہایت خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔ اگر عوام کو اس بات سے تاریکی میں رکھا گیا کہ ملک کے اندر کیا ہو رہا ہے تو وہ ذہنی طور پر اس انقلابی علاج کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوں گے، جو شاید ضروری بات ہو۔"

صاحبو اور دوستو! ہمارا یقین ہے کہ اب بھی اس ملک میں ایسے صاف ذہن، دردمند، اور بیدار ضمیر کے انسان پائے جاتے ہیں۔ جن کے دل و درد کی ترجمانی ان تینوں اقتباسات میں بڑی کامیابی کے ساتھ کی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں شانتی سینا

کے رہنما شری بابا کرشنا چودھری (سابق وزیر اعلیٰ اڑیسہ) شری من موہن چودھری اور بابو آگم پرشاد دور ناکو بھلایا نہیں جا سکتا، جنھوں نے مارچ سنہ ۱۹۶۴ء کے فسادات میں کئی بار اپنی زندگی کو خطرے میں ڈال کر مظلوموں اور بے بس انسانوں کی جان بچانے کی کوشش کی اور جنھوں نے اس موقع پر وہ کتاب شائع کی جس کا نام تھا "میں خاموش نہیں رہ سکتا"۔ اور ایسے کثیر التعداد شریف اور دلیر انسانوں کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا جنھوں نے اپنا فرض ادا کیا۔

یہ بڑی بدقسمتی کی بات ہے کہ عام طور پر جو لوگ اس صورت حال میں کچھ کرنے کے لئے بھی کوشاں ہوتے ہیں وہ اپنے فرقہ یا جماعت کی اصلاح و تربیت کے پُر مشقت اور محنت طلب کام کو چھوڑ کر دوسرے فرقہ اور جماعت کو وعظ و نصیحت، اس کو اخلاقی و علمی درس دینے اور کسی دوسرے گروہ یا عنصر پر واقعات کی ذمہ داری عائد کرنے کے آسان کام کو اختیار کر لیتے ہیں۔ قوموں کی جدید فرقی تعمیر و تشکیل، مختلف عناصر میں دیانت دارانہ اور مساویانہ طریقہ پر ہم آہنگی پیدا کرنے اور ملک کو اس خطرے سے بچا لینے کے لئے جو ننگی تلوار کی طرح اس کے سر پر لٹک رہا ہے۔ فرہاد کا جگر اور قیس کا جنون چاہیئے، حیرت اور اس سے زیادہ حسرت کی بات ہے کہ اپنے ساتھیوں کا بے لاگ اخلاقی محاسبہ کرنے، اور تمام مصلحتوں اور خطروں سے بے نیاز ہو کر طاقت اور اکثریت کے منہ پر کلمہ حق کہنے والے افراد بہت کم نظر آتے ہیں، اور یہ کسی ملک کا سب سے بڑا خلا اور خطرہ کی نشانی ہے۔

خاص طور پر موجودہ حالات اتنے غیر معمولی، اتنے تشویشناک، اور اتنے مہیب ہیں کہ اب معمولی اخلاق اپیلوں یا حکومتی انتظامات سے کام نہیں چل سکتا، اس کے لئے تو ملک کے ضمیر کو جھنجھوڑنے، اس کی روح کو چیخ کر پکارنے، اور انسانی شرم و حیا انسانیت دوستی اور خوف خدا کے آخری رمق سے کام لینے کی ضرورت ہے، جس سے یقیناً ابھی تک اس قدیم مذہبی ملک اور یہاں کا قوم اور یہ بھی دل خالی نہیں ہوا ہے

اس کے لئے چند آدمیوں کو اپنا سر ہتھیلی پر رکھ کر نکلنے کی ضرورت ہوگی، اس کے لئے کچھ مدّت کے لئے اپنے تمام کاموں کو ملتوی اور بالائے طاق رکھنے کی ضرورت ہوگی۔

حالیہ واقعات نے جن کی ابتدا، مرادآباد میں عید کے دن کے واقعہ سے ہوئی یہ ثابت کر دیا ہے کہ ابھی اس ملک میں اس سلسلہ میں کوئی ٹھوس، گہری، پائیدار اور قابلِ اعتبار تبدیلی نہیں آئی۔ یہاں انسان کا احترام ابھی پورے طور پر پایا نہیں جاتا۔ یہاں انسانی جان کی قیمت پورے طور پر نہیں سمجھی گئی۔ ایک جھوٹا سچا نعرہ ہزاروں انسانوں کو پاگل بنا سکتا ہے، ایک صحیح یا مبالغہ آمیز روایت ہزاروں انسانوں کو ردِّ عمل اور انتقام پر آمادہ کر سکتی ہے، کسی اخبار یا آتش بیاں مقرر کی تقریر اچھے اچھے سمجھ دار انسانوں کے دماغی توازن کو درہم برہم کر سکتی ہے اور اس کے نتیجے میں بستیاں لوٹی جا سکتی ہیں، محلے کے محلے ملبوں میں تبدیل کئے جا سکتے ہیں، برسوں کے تعلقات پر دم کے دم میں پانی پھر سکتا ہے، اور ایک جگہ کے سینکڑوں برس کے ہمسایوں کا خون پانی کی طرح بہایا جا سکتا ہے۔ اس حالت میں اس ملک میں کسی تعمیری، فکری کام کی گنجائش نہیں اور اس کو نئے نئے مصائب اور مسائل کا سامنا کرنا ہوگا، میں نے ملک کے تین دانشوروں اور رہنماؤں کے جو اقتباسات پیش کئے ہیں، وہ ان حالات پر پورے طور پر منطبق ہوتے ہیں، اگر وہ زندہ ہوتے تو اس سے زائد کچھ نہ کہہ سکتے، آج بھی ان بیانات میں کسی ایک لفظ کی ترمیم کی بھی ضرورت نہیں۔

ہمیں اپنے گریبانوں میں منھ ڈال کر دیکھنا چاہئیے کہ ہم نے اس ملک کا انسانی شعور بیدار کرنے کے لئے اور انسان کو انسان سے محبّت کرنے کا سبق سکھانے کے لئے اور انسانی جان، انسانی ناموس کی قیمت ذہن نشین کرنے کے لئے کہاں تک اور کتنی جدوجہد کی ہے اور اس کے لئے کب کوئی ہمہ گیر مہم چلائی ہے؟ ہم نے حصول آزادی کے لئے یقیناً جان کی بازی لگا دی، اس کے لئے ایک طویل مہم چلائی جس میں ایک طرف ہر ہندوستانی کے دل میں آزادی کی آگ لگادی، دوسری طرف اس سے برطانیہ کا

قصر استعمار تزلزل میں آ گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نا ممکن بات ممکن ہو گئی، اور ہندوستان کو آزادی مل گئی۔ لیکن ہمیں اس کا اعتراف کرنا چاہیئے کہ ہم نے ملک کو آزاد کرانے کے لیے جتنی کوشش کی قوم کے ضمیر کو آزاد کرانے کی کوشش نہیں کی، ہم نے اس کو برطانیہ کے ظلم سے متنفر بنایا لیکن ظلم کی ہر شکل سے متنفر بنانے کی کوئی کوشش نہیں کی آج بھی ہم ملک کی تعمیر کی جتنی کوشش کر رہے ہیں، قوم کی تعمیر کی اس کی آدھی اور چوتھائی کوشش بھی نہیں کر رہے ہیں، اس کا نتیجہ ہے کہ ملک موجود اور قوم موجود نہیں، ہم اپنی زمین کا ایک انچ بھی دوسرے کے قبضہ میں دینے کے لئے تیار نہیں (اور یقیناً ایسا ہی ہونا چاہیئے) لیکن ہم بے تکلف اپنے ہی جسم کو زخمی کرتے ہیں، اپنا ہی بازو کاٹنے کے لئے تیار نظر آتے ہیں، اپنے ہی ہاتھوں اپنا گھر ڈھاتے ہیں اور ایک بھائی دوسرے بھائی کا گلا کاٹتا ہے۔

دوستو اور بزرگو! کوئی کام شدید جد و جہد، خطرات اور قربانیوں کے بغیر نہیں ہو سکتا، قوم کی صحیح تعمیر اور انسانیت کا احترام اور باہمی اعتماد و محبت پیدا کرنے کے لئے ہم کو ایک مجنونانہ اور سرفروشانہ جد و جہد کی ضرورت ہے، ہندوستان تاریخ کے ایک نازک موڑ اور فیصلہ کن دوراہے پر کھڑا ہے، ایک راستہ ہمیشہ کی تباہی، نہ مٹنے والے انتشار اور نہ ختم ہونے والے زوال کی طرف جاتا ہے۔ ایک راستہ ہمیشہ کے امن و امان، اتحاد و یکجہتی کی طرف لے جاتا ہے، ہر ایسے موڑ پر کچھ ایسے لوگ سامنے آجاتے ہیں جو تاریخ کا رخ اور واقعات کا دھارا بدل دیتے ہیں، ان کی دلیری، ان کی صاف گوئی اور ان کی جانبازی پورے پورے ملک اور قوم کو بچا لے جاتی ہے۔ یہی لوگ ملک کے معمار ہوتے ہیں۔

اکثر ایسے لوگ سیاست اور حکومت کے ایوانوں سے باہر ملک کے بے لوث خادموں اور سچے روحانیوں اور دانش وروں میں پائے جاتے ہیں جن کی نیتوں پر شبہ نہیں کیا جا سکتا جن کی صداقت اور بے غرضی مسلم ہوتی ہے، اور ان کا ماضی ہر داغ سے پاک ہوتا ہے تاریخ

کے مطالعہ سے اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ ایسے موقعوں پر دو طبقے ہوتے ہیں جن سے توقع کی جاتی ہے، اور وہی انسانوں کی امیدوں کی پناہ گاہ ہوتے ہیں، اور یہی ایسے موقعوں پر سر سے کفن باندھ کر آتے ہیں، اور زمانہ کی کلائی موڑ دیتے ہیں، تاریخ کے دھارے اور حالات کے رُخ کو تبدیل کر دیتے ہیں، اور تاریخ نگار کے لئے ایک نیا مواد فراہم کرتے ہیں، پھر ملک و معاشرہ کی زندگی میں ایک نئے باب کا آغاز ہوتا ہے، ایک بے لوث، دانشوروں کا طبقہ اور دوسرا مخلص مذہبی انسانوں کا طبقہ میں "بے لوث" اور "مخلص" کا لفظ جان بوجھ کر استعمال کر رہا ہوں، بے لوث، بے غرض، غیر پیشہ ور غیر مفاد پرست، یہ دو طبقے عام طور سے سب سے آخر میں گراوٹ کا شکار ہوتے ہیں اور جب ان میں بھی خرابی آجاتی ہے تو پھر اس ملت اور تہذیب کو بچانے والی دُنیا میں کوئی طاقت نہیں رہ جاتی، بڑی سے بڑی شہنشاہیاں اور طاقت ور حکومتیں اگر چاہیں کہ اس تہذیب و معاشرہ کو بچالیں تو وہ نہیں بچا سکتیں، اس لئے کہ یہی دو طبقے ہیں جن سے ملک یا معاشرہ کا اعتدال قائم رہتا ہے اور زندگی کی چول صحیح طور پر بیٹھتی ہے، اگر خدانخواستہ یہ بھی اپنا مقام چھوڑ دیں اور اپنے منصب سے ناآشنا ہو جائیں یہ بھی اپنی جگہ تلاش کرنے میں لگ جائیں کہ اس بگڑے ہوئے ماحول میں ہماری کیا جگہ ہے اور یہ سمجھ کر کہ اس ملک یا اس تہذیب کی قسمت میں تباہی تو لکھی ہی ہوئی ہے اور اب یہ کشتی تو ڈوب کر ہی رہے گی، اس لئے ڈوبنے سے پہلے کچھ فائدہ اٹھالیں اور اپنی خواہشات پوری کر لیں تو یہ تبدیلی کسی قوم کے لئے بس قیامت ہوتی ہے پھر اس قوم کو کسی مصنوعی تدبیر یا دنیا کی کسی بڑی طاقت سے بچایا نہیں جا سکتا، اگر دنیا کے سارے مفکر اور تمام فلاسفر جمع ہو جائیں اور حکومت کے سارے وسائل موجود ہوں تو بھی اس ملک یا تہذیب کو کوئی بچا نہیں سکتا، اس لئے کہ دانشور اور مذہب کا صحیح علم رکھنے والا اور اس پر عمل کرنے والا طبقہ ان خطرات سے آگاہ ہو جاتا ہے، جو برادر کشی، انسان دشمنی، مردم آزاری، سفاکی اور سنگدلی سے پیدا ہوتے ہیں، انھوں نے مذہبی کتابوں میں خدا کا ان کے ساتھ معاملہ اور تاریخ میں ان کا انجام پڑھا ہوتا ہے، وہ قوموں کے عروج و زوال کے فلسفہ اور ان کے حقیقی اسباب و علل سے باخبر ہوتے ہیں، ان کو معلوم ہوتا ہے کہ جب یہ خرابیاں

کسی معاشرہ یا اجتماعی نظام میں پیدا ہوتی ہیں تو اس کے نتیجے میں کیا تباہیاں آتی ہیں؟ اس لئے وہ اس صورتِ حال سے سب سے زیادہ تشویش اور خطرہ محسوس کرتے ہیں ہر طبقہ سے زیادہ ان کو اپنی ذمہ داری کا احساس ہوتا ہے اور وہ اس موقعہ پر میدان میں آ جاتے اور ملک، قوم اور معاشرہ کو ہلاکت سے بچانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے ہیں۔ میں اس موقعہ پر بلا کسی معذرت کے قرآن مجید کی ایک آیت پڑھوں گا جس میں ماضی کے آئینہ میں حال کی بولتی ہوئی تصویر موجود ہے اور اس کی اصلاح کے لئے ایسے ہی لوگوں سے توقع ظاہر کی گئی ہے جن کے دماغوں میں کچھ بچی کھچی روشنی اور دلوں پر انسانیت کا راسہا سہا صدمہ اور اثر ہو:

فلولا کان من القرون من قبلکم أولو بقیّۃ ینھون عن الفساد فی الارض الّا قلیلا ممّن أنجینا منھم واتّبع الّذین ظلموا ما اترفوا فیہ وکانوا مجرمین ۝

(سورۂ ہود۔ آیت ۱۱۶)

تم سے پہلے کے انسانی نسلوں اور گروہوں میں کچھ ایسے صاحب شعور لوگ کیوں نہ ہوئے جو ملک میں فساد اور بگاڑ کو منع کرتے ان میں تھوڑے ہی لوگ ایسے ہوئے جو ان خصوصیات کے حامل تھے اور ہم نے ان کو (اس عام تباہی سے) بچا لیا، باقی جنھوں نے اسی زیادتی اور ظلم کا راستہ اختیار کیا وہ انہیں آسائشوں اور طلعت و عیش کے راستہ میں پڑ گئے جن کے ذرائع و مواقع ان کو مہیّا کئے گئے تھے اور وہ مجرم تھے۔

اس صورتِ حال کی اصلاح کے لئے جو ملک کے لئے تباہ کن اس کو بدنام کرنے والی اور بیرونی دنیا کی نگاہ میں اس کو غیر وقیع، بے اعتبار، غیر متمدن اور غیر ترقی یافتہ ثابت کرنے والی ہے اور جس کی اصلاح یا تدارک میں ملک کے ذی شعور، دردمند اور انسان دوست طبقہ کی بہترین توانائیاں اور صلاحیتیں صرف ہوتی ہیں، ایک ہمہ گیر طویل المیعاد پروگرام کی ضرورت ہے جس پر ملک کے دانشوروں، اصلاحی اور تعلیمی کام کرنے والوں اور سیاسی رہنماؤں کو جلد توجہ کرنی چاہیے۔

میں اس سلسلہ میں ان چار نکات کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرنا چاہتا ہوں جو میرے نزدیک فوری طور پر موثر اور مفید ہو سکتے ہیں۔

ا۔۔۔ خالص مذہبی، اخلاقی، انسانی بنیاد پر عوام سے براہ راست رابطہ قائم کرنے کی کوشش اور دوروں، وفود

علاقوں، محلوں، بستیوں، گاؤں اور قصبات کی سطح پر جلسوں اور خطابات کی تنظیم، جن میں انسان کی جان، اس کی عزت آبرو، مال و املاک کی قدر و قیمت ذہن نشین کرنے کی کوشش کی جائے ان کے احترام و تحفظ کی ذمہ داری کا احساس دلایا جائے۔

مذہبی، اخلاقی و انسانی بنیاد پر یہ کام اس لئے مفید اور موثر ہے کہ اس ملک کے باشندوں کا مزاج فطرتاً مذہبی امن پسند، محبت آشنا اور انسان دوست واقع ہوا ہے، وہ اسی زبان کو زیادہ سمجھتے ہیں اور اسی راستے سے ان کے دل و دماغ تک پہنچنا آسان ہے اور اسی کا اثر مستقل اور دیر پا ہوتا ہے، دوسرے اس لئے کہ (افسوس و شرم کے ساتھ یہ بات کہی جاتی ہے) بار بار تجربوں کے بعد عوام کا سیاسی پارٹیوں اور الکشن کے موقع پر منشور اور اعلانات پر سے بھروسہ اور عقیدہ اٹھتا جا رہا ہے اور وہ اس سے متاثر نہیں ہوتے۔

۲۔ پرائمری کے مرحلہ سے لیکر کالجوں اور یونیورسٹیوں کے تعلیمی مرحلہ تک نصاب تعلیم بالخصوص تاریخ کے مضامین اور اس کے نصاب کی اصلاح جو ملک کے دو بڑے فرقوں (مسلمانوں اور غیر مسلموں) کے دل و دماغ میں منافرت کے بیج بونے کا ذمہ دار ہے چونکہ تعلیم و تلقین کا یہ سلسلہ بچپن کے ابتدائی دور سے شروع ہو جاتا ہے اور کتاب میں پڑھی ہوئی باتوں کا یقین (بالخصوص جب ان کو واقعات، قصوں اور کہانیوں سے مستحکم کیا جائے اور استاد بھی اس کے پر جوش مبلغ و داعی ہوں،) طالب علموں کے دلوں میں پیوست ہو جاتا ہے۔ اور وہ ہر لکھی اور چھپی ہوئی بات کو ادب و احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں تو ان کا ذہن و دماغ اسی میں ڈھل جاتا ہے، اور ان کی پوری زندگی اسی کے سائے میں گزرتی ہے یہی زہر ہے جو آج ہمارے پورے معاشرے میں پھیلا ہوا ہے اور کسی وقت وہ ہانڈی کا ابال اور جذباتی اشتعال بن کر فرقہ وارانہ فسادات اور عملی تصادم کی شکل اختیار کر لیتا ہے جب تک اس نصاب تعلیم کی (جس کی داغ بیل انگریزوں نے اپنے سامراجی مقاصد اور پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" (DIVIDE AND RULE) کے اصول کے ماتحت ڈالی تھی) اصلاح نہیں ہوگی، اس امن و آشتی، باہمی اعتماد اور دونوں فرقوں کے درمیان خوش گوار تعلقات کی امید نہیں کی جاسکتی۔

۳۔ ہندوستانی پریس میں اپنی ذمہ داری کا احساس پیدا کرنے کی موثر اور طاقتور اور منظم اور مخلصانہ کوشش، یہ اخبارات اپنے ہیجان انگیز مضامین سنسنی خیز خبروں اور تصویروں کا بالعموم ایک رخ پیش

کرنے اور ایک فرقہ کے ظلم اور ایک فرقہ کی مظلومیت ہی کو نمایاں کرنے کے ذریعے لاکھوں انسانوں کے دل میں نفرت و عداوت کی آگ بھڑکا دیتے ہیں اور کسی فرقہ جماعت یا آبادی کے ایک عنصر کی طرف سے شکوک و بدگمانیوں کا ایک بادل بنا دیتے ہیں۔

میں نے کچھ عرصہ ہوا اسی شہر لکھنؤ میں مدیران جرائد کی ایک معقول تعداد کے سامنے جو ایڈیٹرس کانفرنس میں شرکت کے لئے آئے تھے فارسی کا ایک مشہور شعر کا ایک مصرعہ پڑھا تھا۔ ع

زیرِ قدمت ہزار جان است

شاعر محبوب کو مخاطب کر کے کہتا ہے تیرے قدم کے نیچے ہزاروں جانیں ہیں اس لئے بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ اس مصرعہ میں صرف ایک حرف کی ترمیم کے ساتھ میں نے اس کو اس طرح پڑھا تھا۔

ع زیرِ قلمت ہزار جان است

تیرے قلم کے نیچے ہزاروں انسانی جانیں ہیں۔

واقعہ بھی یہی ہے کہ قلم کی ایک لغزش ہزاروں، لاکھوں انسانوں کی ہلاکت اور شہروں اور بستیوں کی تباہی کا ذریعہ بن جاتی ہے ——— مجھے معاف کیا جائے ایسی حالت میں، میں ایسے ملک کے سرے سے اخبارات سے محروم رہنے اور اس طعنہ کو سننے کو کہ وہ اخبارات اور پریس کے میدان میں دوسرے ملکوں سے پیچھے ہے اور وہ ایک پس ماندہ اور غیر ترقی یافتہ ملک ہے اس پر ترجیح دیتا ہوں کہ لاتعداد اخبارات جو مختلف زبانوں میں نکلتے ہیں اپنے ہی ملک کے باشندوں اور اپنے ہی پڑھنے والوں کی قسمتوں اور جانوں سے کھیلتے رہیں، اور ہم اس پر فخر کرتے رہیں کہ ہمارے ملک میں پریس بالکل آزاد ہے اور وہاں سیکڑوں اور ہزاروں کی تعداد میں مختلف زبانوں میں اخبارات نکلتے ہیں اور ان کا حلقۂ اشاعت بہت وسیع ہے۔

میرے خیال میں ملک کے دانشور اور یہی خواہ حکومت کی مشنری کی مداخلت کے بغیر بھی اخبارات کے ذمہ داروں اور لکھنے والوں کو اپنا پورا خلوص دیکر اور تعلقات کی پوری طاقت صرف کر کے اس پر آمادہ کر سکتے ہیں کہ وہ اپنی ذمہ داری کا زیادہ احساس کریں اور اپنے فرائض اور یگانہ قابلیت و ذہانت کو تخریب و انتشار انگیزی میں صرف کرنے کے بجائے تعمیر اور اتحاد پروری میں صرف کریں، یہ کام ملک کے

دانشور، ادیب، اہلِ قلم (جن میں خود ممتاز صحافی اور جرنلسٹ اور کالم نویس ہیں) بہتر طریقے پر انجام دے سکتے ہیں اور ان کو اس میں زیادہ تاخیر نہیں کرنی چاہیئے۔

۴ــــــ برطانوی حکومت نے اپنی اس کمزوری اور اس حقیقت کا احساس کر کے کہ اس کے نمائندے ہندوستان میں بہت تھوڑی تعداد میں ہیں اور وہ سات سمندر پار سے اس ملک اور اہل ملک کی مرضی کے خلاف اس پر اپنا قبضہ اور اقتدار قائم کئے ہوئے ہے، ہندوستان میں اپنے اور پبلک کے درمیان ایک ایجنسی کی ضرورت محسوس کی تھی جو اس کا پبلک پر رعب و داب قائم رکھے اور جس سے یہاں کے عوام دہشت زدہ اور مرعوب رہیں اور جس کے سہارے وہ یہاں اپنے جابرانہ قوانین نافذ اور حالات کو کنٹرول کر سکے، یہ پولیس کا ادارہ تھا اور چونکہ بدیسی حکومت میں اسکی بنیاد اسی نظریہ پر پڑی تھی، اس لئے اس نے اس کی تربیت دہشت انگیزی پر کی تھی اس کو جان بوجھ کر ہر طرح کی اخلاقی تربیت، ہم وطنوں کے احترام اور لطیف و بلند انسانی احساسات و جذبات سے الگ رکھا تھا، اس کا نتیجہ اس کیریکٹر کی شکل میں ظاہر ہوا جو اس ادارہ کا نہ صرف امتیازی نشان بلکہ قابلِ تعریف اور باعثِ افتخار بن گیا۔

لیکن اب جبکہ ہندوستان آزاد ہے اور ہمارے منتخب کیئے ہوئے بھائیوں کا کام اس ملک پر حکومت کرنا نہیں بلکہ اس کا انتظام سنبھالنا اور پبلک کی خدمت کرنا ہے، پولیس کا معیار اور اس کے بارے میں نقطۂ نظر بدلنا چاہیئے اور اس مفید ادارہ کی تربیت (جو ملک کی آبادی کا ایک اہم جزء اور قابلِ احترام عنصر ہے) بالکل دوسرے نہج پر ہونی چاہیئے، اس میں اخلاقی تربیت، ہندوستانی شہریت، اور انسانی احساسات، دوسروں کی مدد کا جذبہ، کمزوروں پر رحم، چھوٹوں پر شفقت اور پاکباز انسانوں کا احترام اور اپنے فرائض کو بہتر سے بہتر طریقہ پر ادا کرنے کی صلاحیت پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ تاکہ وہ اس طرح سے اہلِ ملک اور اپنے ہم وطنوں کی نظر میں مونس وغمخوار اور معاون و مددگار نظر آئیں۔ دوسرے ملکوں میں حتیٰ کہ خود برطانیہ میں اُن کو اسی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

یہ صرف اس بر اعظم کی خصوصیت ہے جس پر سو برس تک انگریزوں نے حکومت کی ہے

کہ پولیس کو خوف و دہشت اور اجنبیت و بے گانگی کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

اسی طرح اس کی بھی ضرورت ہے کہ پولیس میں اکثریتی فرقہ کے علاوہ دوسرے فرقہ کے بھی بالخصوص مسلم اقلیت کی متناسب نمائندگی ہو۔ اس سے ایک فائدہ یہ ہوگا کہ اس تنظیم کے مختلف اجزاء ایک دوسرے کے ساتھ رہنا سہنا سیکھیں گے، ایک دوسرے کی خوبیوں سے واقف ہوں گے دوسرے ایسے فرقہ وارانہ فسادات کے موقع پر وہ یک طرفہ کارروائی نہیں کرسکیں گے، اس حقیقت پر اکثریتی فرقہ کو وسیع ذہن، اور ٹھنڈے دل کے ساتھ اور حکومت کو حقیقت پسندی اور سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے، اور اس کے لئے جلد اور موثر اقدام کرنے کی ضرورت ہے۔

حضرات! میں نے اور "پیام انسانیت" کے داعیوں اور کارکنوں نے آپکو اسی توقع پر یہاں آنے، اور ایک جگہ جمع ہو کر ملک کی موجودہ صورت حال کا جائزہ لینے، اور اس کو تبدیل کرنے کی تدبیروں پر غور کرنے کے لئے زحمت دی، میں نے آپ کے سامنے ملک کی موجودہ صورت حال کا جو مہیب نقشہ پیش کیا ہے، اس میں قطعاً مبالغہ اور رنگ آمیزی نہیں ہے اور اس پر جس تشویش اور خطرہ کا اظہار کیا ہے اس میں بھی تخیل آرائی یا بدشگونی سے کام نہیں لیا ہے، میں آپ سے اپنی صاف گوئی اور تلخ نوائی کی معافی مانگتے اور اس پر معذرت کرتے ہوئے غالب کا یہ شعر پڑھنے کے بجائے کہ:

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

اس پر متاسف اور نادم ہوں کہ میں اس سے بڑھ کر صاف گوئی اور اس سے زائد تلخ نوائی کی جرأت نہ کرسکا۔ اور میری زبان و قلم نے میرے دردِ دل کا ساتھ نہیں دیا اور اسی شہر لکھنؤ کے قدیم شاعر امیر مینائی کا شعر پڑھ کر رخصت ہوتا ہوں کہ ؎

امیر جمع ہیں احباب دردِ دل کہہ لے
پھر التفاتِ دلِ دوستاں رہے نہ رہے

مختلف مذاہب اور تہذیبوں کے دیس میں

زندگی گزارنے کا طریقہ

نوٹ:

پیامِ انسانیت کنونشن منعقدہ ۲۷، ۲۸ اکتوبر ۱۹۸۰ء کی وداعی تقریر جو ۲۸ اکتوبر شب میں قیصر باغ بارہ دری میں کی گئی اور اس پر جلسہ کا اختتام ہوا۔

حضرات! میں اپنی تقریر کا آغاز حضرت جگر مرادآبادیؒ کے ایک شعر سے کروں گا وہ کہتے ہیں:

عشق ہے پیارے کھیل نہیں ہے
عشق ہے کارِ شیشہ و آہن

پیامِ انسانیت کی آواز پر آپ حضرات ہندوستان کے مختلف حصوں سے یہاں تشریف لائے، مجھے اس بات کا اقرار ہے اور میرے ساتھیوں کو بھی، کہ ہمیں بہت تھوڑا وقت ملا، اس سے کہیں زیادہ مجمع ہو سکتا تھا اور چوٹ کھائے ہوئے دل جو ہندوستان کے گوشے گوشے میں رہتے ہیں اور جن کے لئے ہندوستان ہمیشہ مشہور رہا ہے وہ اتنی بڑی تعداد میں یہاں جمع ہو سکتے تھے کہ لکھنؤ جیسا وسیع شہر بھی شاید اُن کے لئے کافی نہ ہوتا۔ ہمارا دل تو کافی ہو جاتا کہ دل میں بڑی گنجائش ہوتی ہے لیکن شاید شہر میں گنجائش نہ ہوتی، لیکن بہت تھوڑے

وقت میں ہم نے یہ دعوت ملک کے مختلف دور دراز حصّوں میں پہنچائی اور وہ لوگ آسکے جن کو خدا نے اس کی توفیق دی، ان کے لئے آسانیاں تھیں اور وہ بے چین ہوگئے، آپ حضرات نے کل سے اس وقت تک جو کچھ منظر دیکھا ہے اس کی وجہ سے مجھے یہ شعر پڑھنا پڑا،

شاید آپ نے انسانوں کی طرح اس ملک میں رہنے اور بسنے کو بہت آسان کام سمجھ لیا جلسے میں آپ آئے بڑے سکون و اطمینان کے ساتھ آپ نے تقریریں سُنیں، اب اپنے اپنے گھر خیر و عافیت کے ساتھ واپس جائیں گے، شاید آپ یہ سمجھیں کہ "پیامِ انسانیت" کوئی الٰہ دین کا چراغ ہے، جہاں رگڑا کام بنا۔ یہ نہیں، یہ اسی ملک کی بات نہیں ہے میں کہتا ہوں کہ دنیا کے ہر ملک، ہر شہر میں، بلکہ یہاں تک کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ مکّہ اور مدینہ میں بھی جو مسلمانوں کے لئے مقدس ترین شہر ہیں، اور ہمارے ہندو بھائیوں کے لئے بھی اس ملک میں کچھ شہر ہیں، ان شہروں میں رہنے کے لئے شیشہ و آہن کی طرح ساتھ رہنا پڑے گا، یہ الٰہ دین کا چراغ نہیں، آپ نے سمجھا کہ پیامِ انسانیت کی صدا لگائی گئی اور اتنی دور دور سے لوگ اپنا کرایہ خرچ کرکے یہاں جمع ہوگئے معاملہ بہت آسان ہے، اب اس ملک میں محبّت کی بھائی چارے کی ہوائیں چلیں گی، اب کسی فساد کی خبر سننے میں نہیں آئے گی، میں آپ کو دھوکہ میں رکھنا نہیں چاہتا، زندگی زندگی ہے، انسان وہی انسان ہے فطرتِ انسانی وہی فطرتِ انسانی ہے جو لاکھوں برس سے خدا نے اس انسان کی نسل میں ودیعت فرمائی ہے، اور زندگی اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ ہے ہم فرشتے نہیں ہیں اور اسی لئے ہم کو فرشتوں سے زیادہ اجر ملے گا اور خدا کے یہاں ہم کو شاباشی ملے گی اور پیٹھ ٹھونکی جائے گی اور ہمکو وہ انعام ملے گا جس کو شاید فرشتے بھی رشک کی نگاہ سے دیکھیں کہ ہم گر سکتے ہیں فرشتے گر نہیں سکتے، ہم ٹھوکر کھا سکتے ہیں فرشتے ٹھوکر نہیں کھا سکتے، ہم کو غصّہ آتا ہے اور سو بار آئے گا، ہزار بار آئے گا لیکن ہم اپنے غصّے کو دبانا جانتے ہیں، اپنے غصّہ کو پی جانا جانتے ہیں، اپنے غصّہ پر پشیمان ہونا جانتے ہیں، ہمیں اسی زندگی کے ساتھ، زندگی کی ان ہی خصوصیات کے ساتھ، ایک ملک میں نہیں، ایک شہر میں نہیں، ایک محلّے میں نہیں گھر گھر رہنا ہے اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ اب

غلط فہمیاں نہیں ہوں گی، اب شکر رنجیاں نہیں ہوں گی، اب تلخیاں نہیں آئیں گی، اب ہماری تیوری نہیں چڑھے گی، اب ہمارے دماغ پر کوئی ضرب نہیں لگے گی تو وہ اس غلط فہمی کو دور کرلے، ہمیں اس دنیا میں سب کچھ دیکھنا ہے، سب کچھ سننا ہے اور سب کچھ سہنا بھی ہے اور پھر بھی ہم نہ انسان سے مایوس ہیں، نہ اپنی فطرت سے، نہ اپنے اس ملک سے، ہم اگر کہیں جانا بھی چاہیں تو نہیں جا سکتے، ستاروں پر ہمارے لئے جگہ نہیں ہے اور اب آپ سمجھ لیجئے کہ کسی دوسرے ملک میں بھی جگہ نہیں ہے، ہمیں اس ملک میں رہنا ہے، روٹھنا ہے اور منانا ہے، گرنا ہے اور اٹھنا ہے، الجھنا ہے اور سلجھنا ہے، ہمیں یہ سب کام کرنے ہیں، سارے پاپڑ بیلنے ہیں، مگر ہم یہاں رہیں گے اور اسی طرح سے رہیں گے، شہریوں کی طرح، شریفوں کی طرح، بھلے مانسوں کی طرح۔

تو اگر آپ اس جلسے کی یہ پُرسکون فضا دیکھ کر اور یہ تقریریں جو آپ نے سنی ہیں، ان کو سن کر، یہ خیال لے کر یہاں سے جا رہے ہیں کہ اب سب دلدّر دور ہوئے اور سب رنج کافور ہوئے اور اب نہ کسی کی نکسیر پھوٹے گی، نہ کسی کو خراش لگے گی نہ کسی کا دل ٹوٹے گا نہ کسی کو کوئی پریشانی لاحق ہوگی تو اس خواب و خیال کو دور کر دیجئے، اس ملک میں سب کچھ ہو سکتا ہے اور ہوگا اور پھر جب کہ پنبہ و آتش کی بات یعنی آگ بھی ہے اور روئی بھی ہے دونوں رہ سکتے ہیں لیکن اگر آگ کو ہوا دینے والا کوئی ہے اور روئی کو قریب لانے والا کوئی ہے تو پھر اس کا اطمینان نہیں کہ روئی میں آگ نہ لگے گی، ہمارے اس ملک میں جہاں تعمیری طاقتیں ہیں جہاں خیرسگالی اور خیرخواہی کی طاقتیں ہیں، وہاں مختلف اسباب کی بنا پر تخریبی طاقتیں بھی ہیں، وہ اپنا کام کریں گی جیسا کہ ہمارے دوست مولوی عبدالکریم پاریکھ صاحب نے شیطان کا کردار بتایا کہ شیطان دیوار پر گُڑ کی ایک انگلی لگا کر کے الگ ہو جاتا ہے ایسی انگلی لگا کر الگ ہو جانے والے بھی اس ملک میں ہیں، اور رہیں گے، لیکن ہمیں اپنے دماغی توازن کو درہم برہم نہیں ہونے دینا ہے، ہمیں بچوں کی فطرت اختیار کرنی نہیں ہے، ہمارے اندر صبر و ضبط کی طاقت ہونی چاہیئے، ہمارے اندر اخلاق کی جہانگیری ہونی چاہیئے ہمارے اندر یہ صلاحیت ہونی چاہیئے کہ دل پر پتھر رکھ سکیں، اپنی

اس خودداری کو قائم رکھتے ہوئے جس کا اظہار بعض تقریروں سے ہوا وہ بھی انسانی جذبات تھے، میں ان کی بھی گنجائش سمجھتا ہوں لیکن بہرحال ہمیں اپنے دل پر پتھر رکھنا پڑے گا اور پھر اس کے بعد ہمیں ان پتھر دلوں کو موم بنانے کی کوشش کرنی پڑے گی۔

ہمارے سامنے اس سلسلہ میں سب سے اونچا نمونہ خدا کے پیغمبروں کا ہے، وہ کس حال میں اور کس زمانہ میں آئے، ایک آدمی ان کی بات سننے کا روادار نہیں تھا، ایک آدمی ان کی بات سمجھنے کے قابل نہیں تھا، معلوم ہوتا ہے جنگل میں آگئے ہیں، درندوں میں آگئے ہیں کوئی انکی بولی سمجھنے والا نہیں چنانچہ قرآن شریف میں ہے کہ ایک پیغمبر کو خطاب کرکے ان کی قوم نے کہا کہ: "قَالُوا يَا شُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيرًا مِّمَّا تَقُولُ وَإِنَّا لَنَرَاكَ فِينَا ضَعِيفًا" اکثر آپ کی باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں، ہمارے پلے کچھ نہیں پڑ رہا ہے، ہم نہیں جانتے آپ کیا کہہ رہے ہیں، ہم دیکھتے ہیں کہ آپ ہمارے درمیان سب سے کمزور آدمی ہیں، پھر ہم آپ کی بات کیوں سنیں، لیکن انھوں نے کیا کیا، پارس کی بھی کیا حقیقت ہے کہ پتھر کو چھو جاتا ہے تو سونا بنا دیتا ہے، کیمیا کی بھی کیا حقیقت ہے کہ مٹی کو وہ سونا بنا دیتی ہے انھوں نے انسانوں کو فرشتوں سے اونچا کر دیا، انسانوں میں وہ صبر وضبط پیدا کیا کہ اگر تاریخ کی متواتر شہادتیں نہ ہوتیں تو یقین کرنا مشکل تھا کہ انسان اتنا صابر وضابط ہو سکتا ہے، آپ دیکھیں گے کہ جوان کے خون کے پیاسے تھے ان کو انھوں نے سینے سے لگایا دل میں جگہ دی اس کے بعد وہ ان پر اپنی جان نچھاور کرنے لگے، لوگ ان کو مارنے کے لئے آتے تھے لیکن ان کا کلمہ پڑھتے ہوئے وہاں سے رخصت ہوتے تھے جنھوں نے خون کئے تھے اور جن کی آنکھوں سے اب بھی خون ٹپک رہا تھا، انھوں نے ان کو محبت کا پیغام دیا انھوں نے ان کو اپنے سینے سے لگایا پھر دنیا کیا ہوگئی، دنیا میں کیسی ہوائیں چلنے لگیں، خزاں کے بعد بہار کا دور آیا، بادِ سموم کے بعد نسیم جانفزا کے وہ جھونکے چلے آج تک وہ ہم کو محسوس ہو رہے ہیں۔

میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں بغیر کسی معذرت کے کہ اس وقت بھی جو کچھ دنیا میں خیر ہے اس وقت بھی دنیا میں محبت کا جو کچھ مادّہ ہے اس وقت بھی انسانوں کے دلوں میں جو کچھ روشنی ہے اس وقت بھی انسانوں کے دلوں پر درد کی جو چوٹ ہے، وہ سب ان پیغمبروں کا صدقہ ہے

ہم کتنی ہی ترقی کرجائیں، ہم آسمان پر پہنچ جائیں لیکن پیغمبروں کی سطح پیغمبروں کے صبر وضبط کی سطح پیغمبروں کی انسانیت کی سطح پیغمبروں کی رحمت ومحبّت کی سطح سب سے اونچی ہے اور وہاں پر آسمان سے اوپر ایک نیا آسمان نظر آئے گا۔

دوستو اور بھائیو! تھوڑی دیر میں ہم آپ رخصت ہو جائیں گے جیسے رات کے ستارے ڈھل جاتے ہیں اور شمع کے پروانے ایک دوسرے سے رخصت ہو جاتے ہیں لیکن یہ پیغام لے کر جائیے کہ آپ کو اس ملک کی تخریب کو تعمیر سے نفرت کو محبّت سے عداوت کو دوستی سے بداخلاقی کو اخلاق سے بدلنا ہے۔

یہاں دولت پرستی کا جو روگ لگ گیا ہے اور ہمارے اس درخت کو جو گھن کھاتا چلا جارہا ہے پیسے کی حد درجہ بڑھتی ہوئی محبّت اس کے لئے آدمی سب کچھ کرنے کے لئے تیار ہے مجھے ان فسادات کے پیچھے بھی پیسے کی محبّت ہی نظر آتی ہے اس کو میری نظر کی کوتاہی کہیئے یا کچھ کہیئے، مجھے ان فسادات کے پیچھے حسد نظر آتا ہے، تنگ نظری نظر آتی ہے، ہمیں ان حقیقتوں کو سامنے رکھنا ہے، خواب وخیال کی دنیا میں احمقوں کی جنّت میں رہنا نہیں ہے حقائق کا سامنا کرنا چاہیئے۔ اس ملک میں بیماریاں ہیں، اس ملک کو روگ لگ گیا ہے اس ملک کے درخت کو گھن کھاتا چلا جارہا ہے اس ملک کا معاشرہ فاسد (CORRUPT) ہے اس میں بیسیوں ایسی بیماریاں ہیں کہ باہر سے کسی خطرہ کا کوئی خطرہ نہیں، یہ اس کو اندر سے چاٹ جانے کے لئے کافی ہے، برگد کا درخت دور سے کھڑا نظر آتا ہے، بڑا شاندار بڑا عظیم، بڑا مہیب لیکن اندر سے اس کو دیمک چاٹ رہی ہے، ہوا کا ایک جھونکا اس کو گرا سکتا ہے، ہمارا معاشرہ ویسے ہی گھن کھائے ہوئے برگد کے درخت کی طرح ہے، مجھے کہنے کا حق ہے، میں اسی ملک کا رہنے والا ہوں، اور بظاہر میری عمر نہیں گزرے گی، میں ایک بار نہیں، دس بار نہیں، پچاس بار کہوں گا، اس ملک کے معاشرے کو گھن لگ گیا ہے، اس ملک کو دیمک اندر سے چاٹتی چلی جارہی ہے، میں نے لکھنؤ میں اسی بارہ دری کے ایک جلسہ میں کہا تھا " ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں ساری حقیقتیں سب صداقتیں مرچکی ہیں، دو حقیقتیں زندہ ہیں، ایک پیسے

کی محبت، اور ایک فرقہ وارانہ منافرت"۔ میں ڈنکے کی چوٹ پر کہتا ہوں اور یہ بھی ایک ڈنکا ہے میرے پاس اگر اس سے زیادہ بلند آواز کا ڈنکا ہوتا تو میں اس سے زیادہ بلند آہنگی کے ساتھ کہتا کہ اس وقت ہمارا ملک سخت خطرے سے دوچار ہے، قدم قدم پر رشوت دینی پڑتی ہے، قدم قدم پر بد اخلاقی کرنی پڑتی ہے، قدم قدم پر انسان کو اپنی خودداری کو پامال کرنا پڑتا ہے، قدم قدم پر غلامانہ ذہنیت اور سیرت کا اظہار کرنا پڑتا ہے، انگریزوں کے زمانہ میں ہم اتنے غلام نہ تھے، انگریزوں کے زمانے میں ہمارے جسم غلام تھے، آج ذہن غلام ہے، ہمارا ضمیر غلام ہے، غلامی کی بدترین اور خلافِ فطرت قسم وہ ہے کہ بھائی بھائی کا غلام ہو، ایک ملک میں رہنے والے ایک دوسرے پر حکومت کرنے لگیں اور یہ سمجھیں کہ جس کو جو موقع مل جائے اس سے فائدہ اٹھانا چاہیئے وہ اپنے بھائی کے ساتھ وہ معاملہ کرے جو بدیشی حاکم ہندوستانی کے ساتھ کرتے تھے۔ آج ہندوستانی ہندوستانی کے ساتھ وہ معاملہ کر رہا ہے، کچہریوں میں وہ معاملہ ہو رہا ہے، کوتوالیوں میں وہ معاملہ ہو رہا ہے اور افسوس کی بات یہ ہے، مجھے معاف کیا جائے کہ دانش گاہوں اور یونیورسٹیوں میں یہی معاملہ ہو رہا ہے، جو غلامانہ ذہنیت کا آئینہ دار ہے۔ آج سارا ملک دو کیمپوں میں تقسیم ہے، لوگ کہتے ہیں ہندو اور مسلمان، میں کہتا ہوں ایک حاکم ایک محکوم، ایک بیچنے والا ایک خریدنے والا، حاکم اور محکوم کی مثالیں ہم نے تاریخ میں اتنی پڑھی ہیں کہ ہم بے حیا ہو گئے ہیں، دل سخت ہو گیا ہے، لیکن جب ہم ملک میں دیکھتے ہیں کہ ایک شہری دوسرے شہری پر حکومت کرنا چاہتا ہے، اس کو اس طرح ذلیل کرنا چاہتا ہے جس طرح انگریزوں نے بھی نہ کیا ہوگا، آج جس کی بن آتی ہے، جس کی کمان چڑھی ہوتی ہے، جس کے نشانے پر کوئی آ جاتا ہے تو وہ کسر نہیں رکھتا۔ آپ ریلوں کا سفر کریں، ہوائی جہاز کا سفر کریں، پلیٹ فارموں پر انتظار کریں، پارکوں کی بنچوں پر بیٹھیں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کریں، ہر جگہ آپ کو معلوم ہوگا، کہ آپ آزاد نہیں ہیں۔ اس ملک میں عزت کے ساتھ نہیں رہ رہے ہیں، اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ ہم کسی ملک سے آئیں، اپنے ملک کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی اپنی ذلت کا احساس ہوتا ہے، اس سے بڑھ کر ڈوب مرنے کی کوئی بات نہیں کہ میں لندن کے (۱۹۸۲ء) میں اپنے کو

آزاد محسوس کروں، عزّت والا محسوس کروں، امریکہ میں اپنے کو عزّت والا انسان محسوس کروں، سعودی عرب میں اپنے کو عزّت والا انسان محسوس کروں اور اپنے دیس میں آکر پہلے ہی جو واسطہ پڑتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہم غلام ہیں، ہم صبر کئے بغیر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتے ہم کو آج سب کچھ سننا پڑے گا، سب کچھ برداشت کرنا پڑے گا۔ ایئر پورٹ پر دیکھئے پلیٹ فارموں پر دیکھئے، کوتوالیوں میں دیکھئے، جہاں جہاں ضرورت پڑتی ہے، وہاں آپ دیکھئے، ہر جگہ ہندوستانی کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ ابھی آزاد نہیں ہوا، اپنے بھائی سے اپنے جسم کے ایک ٹکڑے سے، اپنے ایک ساتھ رہنے والے شہری سے بات نہیں کر رہا ہے، بلکہ اس سے بات کر رہا ہے جو آسمان سے اترا ہے، یہ صورت حال طبعی و قدرتی (NATURAL) نہیں ہے اس کو بدلنا چاہیئے۔

یہ "پیام انسانیت" اسی کے اندر محدود نہیں کہ فرقہ وارانہ فسادات نہ ہوں، یہ فسادات تو کبھی کبھی ہوتے ہیں اور کبھی کبھی ہی ہو سکتے ہیں لیکن جو فساد گھر گھر ہو رہا ہے، وہ فساد جو قدم قدم پر ہو رہا ہے، وہ فساد جو ہمارے اندر رچ رہا ہے وہ فساد جس سے ہیں چوبیس گھنٹے واسطہ پڑتا ہے وہ بھی فساد ہے ہمیں اس فساد سے بھی بچنا چاہئے اور اس فساد کو روکنا چاہیئے۔

میرے بھائیو اور دوستو! راستہ بڑا لمبا ہے اور یہ پھولوں کی سیج نہیں ہے یہ کانٹوں اور انگاروں کی چتا ہے جس پر سے آپ کو گزرنا ہے، میں آپ کو دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتا، جب یہاں سے آپ جائیں گے تو محبت کی ہوائیں چل رہی ہوں گی ممکن ہے یہاں سے نکلتے ہی آپ کو کوئی ایسا تلخ تجربہ ہو، جہاں آپ کہیں کہ کہاں آگئے ؛ قدم قدم پر اس کا تجربہ ہو رہا ہے اور یہ سب ہمارا اور آپ کا کیا دھرا ہے قرآن نے کہا ہے :

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ خشکی اور تری میں بگاڑ پھیل گیا، کرپشن (CORRUPTION) پھیل گیا ہے۔ خشکی اور تری میں، سمندروں کو دیکھئے، پہاڑ کی چوٹیوں پر دیکھئے، غاروں کے اندر دیکھئے، کرپشن پھیل گیا ہے کہ انسان کی فطرت کا خالق انسان کو بنانے والا کہتا ہے کہ "بما كسبت أيدي الناس" لوگوں کے

اعمال کی وجہ سے لوگوں کے کرتوتوں کی وجہ سے ہمارے اعمال میں یہ پیسے کی حد سے بڑھی ہوئی محبت یہ خون کا سفید ہو جانا، خدا سے نہ ڈرنا، انسانیت کا احترام نہ کرنا، انسان کی قدر و قیمت کا نہ پہچاننا ہر انسان کو گاہک سمجھنا، میں کہتا ہوں، دفتروں میں لوگ بیٹھے ہوتے ہیں، جہاں کوئی آدمی کام سے آیا، انھوں نے کہا بڑی موٹی آسامی ہے، بس اب اس سے سب وصول کر لیا جائے گا، چاہیے تھا کہ اٹھ کر استقبال کیا جاتا اور کہا جاتا کہ میں یہاں اس لئے بیٹھا تھا کہ تمہاری سیوا کروں، تمہاری خدمت کروں، میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا تھا، کس مصرف کا تھا، تم آئے، تم نے مجھے باکار اور قیمتی بنا دیا، کہیئے کیا حکم ہے، ہم آپ کی کیا سیوا کر سکتے ہیں؟ آدمی کے دھڑکتے ہوئے دل پر اس کی نظر نہیں ہوتی، اس کے مضطرب دماغ پر نظر نہیں ہوتی، اس کی پیشانی پر پسینہ کے قطرے پر نظر نہیں ہوتی، اس کے چہرے پر جو زردی چھائی ہوتی ہے اس پر نظر نہیں ہوتی، اس کی جیب پر نظر ہوتی ہے، دیکھا جاتا ہے کوئی بڑا نوٹ جھانک رہا ہے کہ نہیں اور ہوشیار آدمی جب اپنا کام کرانے جاتے ہیں تو نوٹ اس طرح رکھتے ہیں کہ کچھ دکھائی دیتا ہے، کچھ چھپا ہوا کچھ نکلا ہوا تا کہ معلوم ہو جائے کہ میرے پاس "مشکل کشا" موجود ہے۔ یہ "قاضی الحاجات" موجود ہے، یہ کیا انسانیت ہے، اس انسانیت میں کوئی مزا ہے؟

حضرات! آپ کا کام بہت مشکل ہے، آپ یہاں سے جائیں گے، شربت کے گھونٹ نہیں، بڑے کڑوے گھونٹ آپ کو پینے پڑیں گے، بڑے صبر و ضبط سے کام لینا پڑے گا، میں کیا کہوں، جو کچھ مجھے کہنا تھا میں نے اپنے ناچیز خطبہ میں کہہ دیا کہ انسان میں تو خود ہی کمزوریاں تھیں، ان کمزوریوں کو ہوا دینے کی کیا ضرورت تھی، ہمارے اخباروں کو کیا ضرورت تھی ہمارے مضمون نگاروں کالم نویسوں کو کیا ضرورت تھی ہماری سیاسی پارٹیوں اور لیڈروں کو کیا ضرورت تھی کہ اس مادّہ کو (جو تنا سب کے ساتھ رکھا گیا ہے) بھڑکاتے اور اس کو مشتعل بناتے؟ بھائیو! انسانوں کو اپنی فطرت پر چھوڑ دو، ان کو غصّہ بھی آئے گا لیکن تم غصّہ دلانے کی بات کیوں کرتے ہو، ان کے اندر کا غصّہ، ان کے اندر کا لاوا کیا کم ہے، کہ تم باہر کا لاوا لاتے ہو، ہمیں اس ملک میں پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑے گا، ہمیں، ہمارے اخبار نویسوں کو، ہمارے سیاسی لیڈروں، ہماری تعلیم گاہوں کے استادوں

ہمارے دفتروں کے افسروں کو سب کو یہ سمجھنا ہوگا کہ ہمارا واسطہ ہمارے بھائیوں سے، بیٹوں سے جگر کے ٹکڑوں سے ہے، باہر کے لوگوں سے نہیں ہے، ہمیں کیا شکایت دوسروں سے ہو سکتی ہے جب ہم ایک دوسرے کو ذلیل کرتے ہیں، نوٹ انسان کی عزت بچائے تھے ہم ایسی زندگی پر لعنت ہے ایسی زندگی پر، کاغذ کا ایک ٹکڑا یہ پیسہ جس کو ہم نے ڈھالا ہے ہماری عزت بچائے، یہ تو انسانیت کا انتہائی زوال ہے کہ ہمیں اپنے دل کے بجائے جس پر کہ خدا کی تجلیاں نازل ہوتی ہیں، اس دماغ کے بجائے جس نے دنیا کو روشنی سے بھر دیا ہے، دھوکہ اور چالاکی سے، رشوت اور بے ایمانی سے کام لینا پڑے۔

میں تاریخ کا طالب علم ہوں، میں نے سیکڑوں، ہزاروں حکومتوں کے چراغ گل ہوتے دیکھے ہیں، میں نے ہزاروں طاقتوں کو دم توڑتے دیکھا ہے، کون سی طاقت ہمیشہ رہی ہے جو آج کسی کی طاقت ہمیشہ رہے گی، کس کا جادو چلا ہے اور چڑھ کر بولا ہے، جو آج کسی کا جادو چلے گا اور چلتا رہے گا، جو چراغ جل رہا ہے وہ بجھے گا اس لئے کہ ہم نے ہزاروں چراغوں کو بجھتے دیکھا ہے، اگر وہ ہزاروں چراغ بجھ سکتے ہیں جن کے لئے ہزاروں فانوس بنائے گئے تھے تو آج کا چراغ کیوں بجھ نہیں سکتا؟

اپنی ہستی کو پہچانو، اپنی حیثیت کو جانو، اپنے خدا کو پہچانو، سمجھو کہ موت اب بھی تمہاری تاک میں کھڑی ہے، آسمان والا اب بھی آسمان والا ہے، اس کے پاس سب آسمانی لشکر ہے ایک تارے کو توڑ دے، تمہارا خاتمہ ہو جائے اور ستارہ تو بہت دور کی چیز ہے، خود تمہارے اوپر کسی وقت دورہ پڑ جائے، ایک ایٹم بم کا تجربہ کر لو، ایک ہائیڈروجن بم کا تجربہ کر لو، یہی انسانیت جس پر تم کو بڑا ناز ہے، یہ لمبے چوڑے لق و دق ملک جس پر تم کو بڑا ناز ہے، یہ انسانی سوسائٹی جس کے ہر وقت تم گن گاتے ہو، یہ ایک سکینڈ میں ختم ہو جائے گی، جو چیز رہنے والی ہے اس سے رشتہ جوڑو، اس کو پہچانو۔

میں ایک بات کی اور وضاحت کر دینا چاہتا ہوں، اور اس کو ضروری سمجھتا ہوں بار بار "پیامِ انسانیت" کی تحریک کی نسبت میری حقیر ذات کے ساتھ کی گئی ہے، بار بار کہا

گیا ہے کہ مولانا نے جو پیام دیا ہے مولانا کی تحریک "پیام انسانیت" میں صاف صاف آپ سے کہتا ہوں یہ میری تحریک نہیں ہے، میری کوئی ہستی نہیں ہے، مجھے خود پیام انسانیت کی ضرورت ہے، کسی وقت غصہ آجائے، کسی وقت میں اپنے حدود سے آگے بڑھ جاؤں، آپ مجھے پیام انسانیت دیجئے۔ یہ پیام انسانیت پیغمبروں کا پیام ہے، یہ پیام انسانیت خدا کے ان سچے اور روحانی انسانوں کا پیام ہے، یہ پیام انسانیت حقیقی انسانیت کا پیام ہے، انسانیت پیام انسانیت دے رہی ہے، زندگی پیام انسانیت دے رہی ہے، میری کیا ہستی ہے، آج رہوں کل نہیں رہوں گا، اس چیز کی نسبت میری طرف نہ کیجئے، اس کی نسبت خدا کے پیغمبروں کی طرف کیجئے، تاکہ برکت آئے، اس کی رحمت نازل ہو، اس کی نسبت خدا کے اتارے ہوئے صحیفوں کی طرف کیجئے، تاکہ خدا کے یہاں قبولیت ہو، اس کی نسبت اچھے مخلص، اور دردمند انسانوں کی طرف کیجئے۔

میں بہت خوش ہوں اور شکر گزار بھی ہوں، اپنی طرف سے اور اپنے بھائیوں اور دوستوں کی طرف سے بھی کہ بہت تھوڑے وقت میں، بڑی کمزور آواز پر آپ حضرات اتنی دور دور سے اپنے ضروری کام چھوڑ کر یہاں آئے، یہ اس بات کی علامت ہے کہ ابھی آس باقی ہے ابھی انسانیت زندہ ہے، ایک آدمی جو سیاسی لیڈر نہیں، جو کسی کرسی پر بیٹھا ہوا نہیں، معمولی درجہ کا خدمت گار، کچھ لکھنے پڑھنے والا آدمی، اس کے چند دوست جو اپنا اپنا پیشہ کرتے ہیں اور اپنا پیٹ بھر لیتے ہیں، انھوں نے ایک صدا لگائی، آواز دی اور بلایا اور آپ یہاں آگئے، یہ آپ کے دل کی آواز ہونی چاہئے، یہ صرف ہماری آواز نہیں ہے، اس کو ہندوستان کے گوشہ گوشہ تک پہنچایئے اور ہندوستانی شہریوں میں صبر وضبط کی عادت ڈالئے، افواہوں پر بے سوچے سمجھے یقین کر لینا، ایک ناممکن سے ناممکن بات کو مان لینا بڑی خطرناک بات ہے الرجی (ALERGY) کی ایک نئی قسم ہے۔ انسان ایسا الرجک (ALERGIC) ہو گیا ہے کہ ذرا سی بات سے اس کے اعصاب متاثر ہو جاتے ہیں اور وہ فوراً جوش میں آجاتا ہے اس عادت کو بدلئے "لنتنہ بڑے ملک" کی امانت اللہ نے ہمارے حوالے کی ہے، اس بار کو اٹھانے

اور اس کی حفاظت کے لئے بڑی قابلیت، بڑی لیاقت کی ضرورت ہے، بڑے دل گردے کی ضرورت ہے، بڑے ایمان کی ضرورت ہے، بڑی محنت کی ضرورت ہے، پختہ سمجھ اور بالغ عقل کی ضرورت ہے، یہ صفات اپنے اندر پیدا کیجئے۔

ان الفاظ کے ساتھ میں آپ سے رخصت ہوتا ہوں اور اپنی طرف سے اور اپنے دوستوں کی طرف سے جنھوں نے بہت تھوڑے وقت میں انتظام کیا۔ آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور آپ کی طرف سے ان کو مبارکباد دیتا ہوں (اگر آپ کی اجازت ہو) انھوں نے اتنے آدمیوں کو بلاکر بٹھا دیا اس سے پتہ چلتا ہے کہ انسانیت مری نہیں ہے، انسانیت سے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔

واٰخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین ۝